© rasailojaraid.com

اسلام اور جمہوریت: چند نظریاتی اور عصری پہلو

خورشید احمد*

ترجمہ: عبداللطیف الفت

آج جب ۲۱ ویں صدی کی ابتدا ہو رہی ہے اور عالم انسانیت تیسری ہزاری میں قدم رکھ رہا ہے، دنیا چند خیرہ کن دعووں اور اضطراب انگیز اندیشوں میں گھری ہوئی ہے۔ ایک طرف تو یہ دعوے ہیں کہ کمیونزم اپنے انجام کو پہنچ چکا، سرد جنگ ختم ہو گئی اور مغربی لبرل ازم کو سیاسی اور معاشی محاذ پر قطعی فتح حاصل ہو چکی ہے، جس کے نتیجے میں تاریخ اب اپنے نقطۂ انتہاء کو پہنچ گئی ہے[1]۔ دوسری طرف یہ شور و غوغا بھی بڑے پیمانے پر برپا ہے کہ مذہبی احیا کی لہر اٹھ رہی ہے اور دنیا بھر میں بنیاد پرستی کا طوفان آنے والا ہے اور تہذیبی تصادم کے خدشات پیدا ہو رہے ہیں[2]۔ چنانچہ ناگزیر ہے کہ سنجیدہ مزاج دانشور، بالخصوص مسلم امہ کے ترجمان مفکرین، ان مسائل کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں جو نہ صرف علمی دنیا میں بلکہ طاقت کے ایوانوں میں بھی زیر بحث ہیں اور ان نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام اور مسلم امہ کے لیے نئی حکمت عملی وضع کریں۔

دور حاضر میں عالم انسانیت کو عمومی طور پر اور عالم اسلام کو خصوصی طور پر جن مسائل کا سامنا ہے ان میں سے چند اہم مسائل یہ ہیں: عالمگیریت (Globalization)، لبرل ازم، جمہوریت، نج کاری، سیکولرازم، مذہب کا احیاء اور عالمی دہشت گردی کا آسیب۔ زیر نظر مقالے میں جمہوریت سے متعلق مباحث کے چند پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مغربی تہذیبی اور سیاسی پس منظر میں پروان چڑھنے والی جمہوریت نہ تو سراسر یکسانیت کی حامل ہے اور نہ ہی اس حد تک مکمل کہ اس کی ہیئت پر کوئی

---

*چیئرمین، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعتراض وارد نہ ہو سکے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نظریاتی اور عملی دونوں پہلوؤں سے جمہوریت ایک کثیر پہلو حیثیت کی مظہر ہے۔ چنانچہ یہ فرض کر لینا کہ مغربی جمہوریت کا کوئی ایک مخصوص نمونہ ساری انسانیت کے لیے بہترین سیاسی نظام کی حیثیت رکھتا ہے نہ صرف فکری دیانت کے لیے نا قابل قبول ہے بلکہ ثقافتی اعتبار سے بھی ناممکن ہے۔ مسلمانوں کے لیے بعینہٖ اس کی پیروی بالخصوص اس لیے ممکن نہیں کہ ان کی اپنی واضح اخلاقی اور نظریاتی شناخت اور اپنا تاریخی اور ثقافتی تشخص ہے۔ عالمگیریت دور جدید کا ایک رجحان ضرور ہے لیکن اسے کسی صورت میں جدید نوآبادیاتی نظام کا پیش خیمہ نہیں بننا چاہیے۔

مغربی جمہوریت کا نظریہ اور عملی تجربہ اگر چہ بذات خود بہت بیش بہا اور متنوع ہے لیکن گہرے غور و فکر اور تجزیہ سے اس میں نہ صرف متعدد فکری خامیوں کی نشاندہی ہوتی ہے بلکہ اس کی عملی شکل بھی تضادات، وضعی خرابیوں اور ناکامیوں سے بھرپور ہے۔ W.B. Gallie نے اسے بجا طور پر ایک ''لازمی متناقض نظریہ'' قرار دیا ہے[3]۔ مسلم ممالک بلکہ تیسری دنیا کے ممالک کے لیے اسے جوں کا توں قبول کرنا کوئی حقیقت پسندانہ رویہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ چنانچہ امریکہ اور دیگر مغربی طاقتوں کی طرف سے باقی دنیا پر بلا امتیاز دباؤ، جوڑ توڑ یا براہ راست طاقت کے ذریعے مغربی سیکولر جمہوریت کی کسی بھی شکل کو پروان چڑھانے کی خارجہ پالیسی انتہائی نامناسب ہے۔

جمہوریت کے دو اہم پہلوؤں میں امتیاز کرنا ضروری ہے: اول، اس کی فلسفیانہ بنیادیں، جن میں عوام کی حاکمیت کا تصور اور اس کا مستخرج نظریہ کہ حکومتیں وہی جائز ہیں جو عوامی تائید سے قائم ہوں اور دوم، اس کو عملی جامہ پہنانے کے مختلف انداز جن کے ذریعے حکمرانوں اور ان کی پالیسیوں اور پروگراموں کے انتخاب میں عوام کی شرکت یقینی بنائی جاتی ہے۔

اسلام کے بنیادی عقائد، اس کی ثقافت، تاریخ اور عصر حاضر کے تجربوں کے حوالے سے اس مصنف کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اسلام میں ایسے جداگانہ خطوط کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی بنا پر ایک ایسا بے مثل اور ممتاز سیاسی ڈھانچہ تشکیل دیا جا سکتا ہے جس میں عوام کی شرکت یقینی ہو اور جو اپنی روح اور جوہر کے اعتبار سے 'عدل' اور شوریٰ کے متصل اصوں پر مبنی ہو اور یہی عملی جمہوریت کا حقیقی مدعا ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ سیکولر جمہوریت کی متعدد خامیوں، ناکامیوں اور تضادات کا حل بھی اسی میں تلاش کیا جا سکتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ سیکولر جمہوریت کو مسلمانوں کے حلق سے زبردستی اتارنے کی ہر کوشش حکمرانوں کے جبر واستبداد کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اصل جمہوری عمل کے ذریعے (democratization) اگر مسلم عوام کو ان کے اعلیٰ نظریات اور تمناؤں کے مطابق اپنے معاملات آزادانہ طے کرنے کا موقع ملے تو اس کا لازمی نتیجہ اسلامائزیشن کی صورت میں سامنے آئے گا کیونکہ یہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد توحید پر ہے۔ یہ ایک مقبول خلافت کی شکل میں پھلتا پھولتا اور شورائیت کے اصولوں کے مطابق کام کرتا ہے۔ اس کی بنیاد انسانی مساوات، قانون کی حکمرانی، اقلیتوں سمیت انسانوں کے حقوق کے تحفظ، حکمرانوں کی (عوام اور خدا کے سامنے) جوابدہی اور شفاف سیاسی عمل پر رکھی جاتی ہے اور اس کا اولین مقصد قانونی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور بین الاقوامی عدل کا قیام ہوتا ہے۔ شریعت وہ وسیع ڈھانچہ مہیا کرتی ہے جس کے اندر عوام مشیت ایزدی کے سائے تلے ایک مہذب معاشرے اور اس کے اداروں کو جن میں ریاست کے تمام شعبے شامل ہیں پروان چڑھاتے ہیں۔ اسلامی نظام سیاست کے ماڈل میں ہی یہ اہلیت ہے کہ وہ حقیقی سیاسی اور معاشرتی کثرتیت (pluralism) کو جنم دے سکے۔

چنانچہ اس کے اندر مختلف النوع مذہبی، نسلی اور لسانی گروہ، ثقافتیں اور تہذیبیں، قومی اور عالمی سطح پر صحت مند انداز میں بیک وقت نشوونما پا سکتی ہیں۔ اس نظام میں عمودی مطابقت اور افقی ہم آہنگی اس انداز میں پائی جاتی ہے جس سے پوری انسانیت کے لیے ایک پرامن اور عادلانہ سیاسی اور معاشرتی ڈھانچہ قائم ہو سکتا ہے اور اس دور میں جبکہ دنیا سکڑ کر ایک عالمی شہر کی شکل اختیار کر رہی ہے، یہی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

جمہوریت: مغربی نظریہ اور تصور

جمہوریت (democracy) کا لفظ سولھویں صدی میں انگریزی زبان میں فرانسیسی لفظ democratie سے اخذ کیا گیا ہے جو اپنی اصل میں یونانی لفظ demokratie سے مشتق ہے۔ اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنیادی معنی demos یعنی عوام اور kratos یعنی حکومت کے ہیں۔

جہاں تک اسلامی لٹریچر کا تعلق ہے لفظ ''جمہوریت'' سب سے پہلے اٹھارہویں صدی میں ترکی زبان میں استعمال کیا گیا اور یہ عربی لفظ ''جمہور'' سے ماخوذ تھا جس کے معنی عوام یا ان کے اجتماع اور اکٹھ کے ہیں۔ یہ لفظ فرانسیسی جمہوریہ (French Republic) کے حوالے سے استعمال ہوا[۴]۔

لفظ جمہوریت ایک ایسی طرزِ حکومت کی طرف منسوب ہوتا ہے جو اشرافیہ، بادشاہت، آمریت یا مطلق العنانی کے برعکس اصولِ حکومت اور طرزِ حکومت کے سلسلے میں ہی نہیں بلکہ اقدار، اصولِ حیات، نظریاتی مثالیوں اور پالیسیوں کے لیے بھی عوام کو قوت کا سرچشمہ اور مرکزی نقطہ قرار دیتا ہے۔ اس میں عوام ہی کو حاکمیت اعلیٰ کا مالک سمجھا جاتا ہے، جنہیں حکمرانی کا اصل حق ہوتا ہے اور جن کے سامنے اربابِ اقتدار جواب دہ ہوتے ہیں۔ جمہوریت کی اصطلاح، نظریات اور اصولوں کے ایک مجموعہ اور ایک نظام سیاسی کی نشان دہی کرتی ہے جو حکمرانی کی ایک طرز بھی ہے اور اس کا اپنا سیاسی اور قانونی کلچر ہے۔

جمہوریت کی اصل پہچان اس کا حکومتوں کے جواز کا اصول ہے جس کے تحت صرف وہی اقتدار جائز ہے جو عوام کی طرف سے بخشا گیا ہو اور ان کی رضامندی پر مبنی ہو۔ یورپی تاریخ کے نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے بعد کے دور میں بادشاہوں کے اس دعوے کو چیلنج کیا گیا کہ انہیں حکومت کرنے کا آسمانی یا الوہی حق حاصل ہے۔ عوام نے یورپ کی بادشاہتوں کے ساتھ ساتھ چرچ کی بالادستی اور کلیسائی حکمرانی کے خلاف بھی بغاوت کر دی۔

اس پس منظر میں عوام کی حاکمیت کا تصور پروان چڑھا جس نے سیاست کا مذہب اور الوہی حکمرانی سے تعلق بالکل ختم کر ڈالا۔ عوام سیاسی قوت کے سرچشمے کے طور پر تسلیم کر لیے گئے اور اپنی تقدیر کے خود مالک قرار پائے۔ تمام اقدار، حکمرانی کا منبع ہونے کا تاج ان کے سر پر سجا دیا گیا اور ہر قسم کے سیاسی عمل کا مقصد ان کی فلاح و بہبود اور تقویت ٹھہرا۔

جمہوریت کی فلسفیانہ بنیادیں ''عوام کی حاکیت اعلیٰ'' کے تصور میں پیوست ہیں۔ اس کے تحت ایک طرف تو دائمی مذہبی رہنمائی یا حتمی اخلاقی اقدار کے وجود سے ہی انکار کیا جاتا ہے یا کم از کم انہیں سیاسی حکمرانی سے قطعاً لاتعلق سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف اس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ عوام اور ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رضا ہی تمام اختیارات اور قوت کا اصل سرچشمہ ہے۔ الغرض قانونی اور سیاسی حاکمیت اعلیٰ عوام کو پوری طرح تفویض کر دی گئی اور اس طرح جمہوری طرزِ حکومت کے مختلف طریقے اور ڈھانچے تشکیل پائے جن میں براہِ راست، بالواسطہ نمائندگی، فنکشنل، پارلیمانی، ری پبلیکن، وفاقی اور پرولتاری وغیرہ شامل ہیں۔ Richard Jay کے مطابق ''یہ عوام کی حاکمیت اعلیٰ کا اصول ہی تھا جس کی قوت کے بل پر انیسویں صدی میں جمہوریت کی تحریک آگے بڑھتی رہی''۵۔ اب ''عوام'' کا تصور نظریاتی اور عملی دونوں اعتبار سے کتنا ہی مبہم کیوں نہ رہا ہو مغربی سیکولر جمہوریت کی فلسفیانہ اور اخلاقی بنیادیں اسی تصور پر استوار ہیں۔

جمہوریت کی دوسری جہت کا تعلق حکومتِ خود اختیاری (self - government) اور سیاسی امور کی سرانجام دہی میں عوام کی شمولیت کے گوناگوں ڈھانچوں سے ہے، یعنی ریاستی معاملات کو چلانے کے سلسلے میں عوام کی رضا معلوم کرنے کے لیے مختلف طریقے کس طرح اختیار کیے جائیں۔ یہ عملی طریقے حریت اور مساوات، دستور اور قانون کی بالادستی، ریاست کے مختلف شعبوں یعنی انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے درمیان اختیارات کی تقسیم، اقلیتوں سمیت سب کے بنیادی حقوق کے تحفظ، عقیدہ، آراء، اظہار، تنظیم سازی، پریس اور دیگر ذرائع ابلاغ کی آزادی کے اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں۔

جمہوریت کی روح کا اظہار عوام کی آزادانہ رائے سے منتخب حکومت میں ہوتا ہے، جو عوام کی خواہشات اور ترجیحات کے مطابق ان کی خدمت کرے اور ان کے سامنے جواب دہ ہو۔ مغربی جمہوریت کا ماڈل مذہب اور سیاست کی علیحدگی پر تعمیر کیا گیا ہے اس لیے اس کا تعلق اور واسطہ صرف ان کی دنیوی فلاح و بہبود کے ساتھ ہوتا ہے۔ مذہب اور سیاست کی علیحدگی کا یہ جذبہ اس کے تمام قوانین کے مجموعوں اور حقوق انسانی کے تابناک اصولوں میں کارفرما ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات تسلیم کرنا مناسب ہوگا کہ مغربی ممالک نے جمہوریت کے ساتھ اپنی لگن کی بنا پر حکومت میں عوام کی عملی شرکت کے چند نہایت قیمتی تجربے کیے ہیں۔ کثیر سیاسی جماعتوں کا نظام، معین عرصے کے لیے سیاسی قیادت کے انتخاب کے مختلف طریقے، انتظامیہ اور عدلیہ میں علیحدگی، قانون سازی کے لیے اداروں کا قیام ــــ جو حالات کی مناسبت سے یک ایوانی بھی ہوتے ہیں اور دو ایوانی بھی ــــ یہ سب اس سیاسی منصوبے اور نظام کے اہم پہلو ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن مغرب میں جمہوریت کا تجربہ تمام تر نعمت ہی ثابت نہیں ہوا۔ چند تاریخی کارناموں کے باوجود مستحکم اخلاقی اقدار کے فقدان کے باعث اس تجربہ میں بہت سی کمزوریاں اور متوقع نتائج حاصل کرنے میں ناکامیاں نظر آتی ہیں۔ چونکہ اس نظام میں دائمی اقدار کا کوئی وجود ہی نہیں اس لیے صحیح اور غلط کا فیصلہ عوام کے من کی موج پر ٹھہرا، جنھوں نے اپنی اخلاقی قدریں اتنی ہی تیزی سے بدلنی شروع کر دیں جس تیزی سے وہ اپنے لباس اور فیشن بدلتے ہیں۔ چنانچہ نمایاں اخلاقی بے راہ رویوں اور غلط کاریوں کو معصومیت کا مقام دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی معاشرہ اخلاقی اضافیت (moral relativism) کی زبردستیوں، اکثریت کی حکمرانی کی حماقتوں، گروہی، نسلی اور طبقاتی کشمکش، معاشی گروہ بندیوں اور استحصال کا شکار ہو گیا۔ اس طرح ان تمام اساسی اصولوں کی عمارت جن پر انسانی معاشرہ ازل سے قائم و دوائم تھا، دھڑام سے نیچے آ رہی۔

جمہوریت نے حق و صداقت اور عدل کا معیار محض ووٹوں کی گنتی کو قرار دیا اور اہلیت پر مجرد تعداد کو فوقیت حاصل ہو گئی۔ تنگ نظری پر مبنی جماعتی سیاست نے اس نظام کو مزید نقصان پہنچایا۔ بعض ممالک میں یک جماعتی نظام رائج کر دیا گیا اور اس طرح جمہوریت کے لبادے میں ایک پارٹی کی آمریت قائم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ اُن اصولوں کی اہمیت کم ہوتی گئی جن پر جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اس کی عملی شکلیں جمہوریت کے اصل نظریے سے اتنی مختلف ہو گئیں کہ یہ سارا سلسلہ ایک تماشے کی حیثیت اختیار کر گیا۔

Giovanni Sartori کی رائے اس سلسلے میں یہ ہے:

> کم از کم معیار کے مطابق جائزہ لیا جائے تو تقریباً نصف دنیا کو جمہوریت کے دائرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اوسط معیار سے جانچیں تو جمہوری ملکوں کی تعداد اور بھی کم ہو جاتی ہے اور اگر کڑا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ صرف درجن بھر ملک تسلی بخش حد تک جمہوری قرار دیے جا سکتے ہیں۔ یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ ''جمہوری'' کا لیبل کتنی آسانی سے ''غیر جمہوری'' میں اور ''غیر جمہوری'' کا ''جمہوری'' میں بدلا جا سکتا ہے، صرف معیار بدلنے کی زحمت کرنی پڑتی ہے--- مغربی دنیا کے لوگ عرصہ دراز سے جمہوری نظام کے تحت زندگی گزارنے کی وجہ سے اب اس مقام تک آ پہنچے ہیں جہاں وہ اس فریب نظر سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکلتے ہوئے نظر آ رہے ہیں--- یہاں تک تو ہم یہ تعین کر سکتے ہیں کہ جمہوریت کیا ہے:

یعنی جمہوری اور غیر جمہوری نظام میں واضح فرق موجود ہے۔ لیکن جونہی ہم اس اصطلاح کا اطلاق تیسری دنیا کے ممالک پر کرتے ہیں اور خصوصاً نام نہاد ترقی پذیر ملکوں پر تو معیار اتنا پست ہو جاتا ہے کہ لفظ جمہوریت کے اطلاق کے مناسب ہونے پر غور کرنا پڑ جاتا ہے[٦]۔

Foreign Affairs کے ایک حالیہ شمارے میں Thomas Carothers اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ جمہوری انقلاب اب دنیا بھر میں ٹھنڈا پڑ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے:

جو تحریک آج سے چند سال قبل اپنے بہت سے پرجوش حامیوں کو انسانیت کے عظیم اتحاد کا باعث بنتی نظر آ رہی تھی اس کے بارے میں خدشہ ہے کہ آئندہ چند عشروں میں مغربی دنیا (بشمول لاطینی امریکہ، مشرقی یورپ اور سابق سوویت یونین کے بعض حصے) اور غیر مغربی دنیا میں سیاسی تقسیم کو گہرا کر دے گی۔ یہ تہذیبوں کے تصادم کی پیشین گوئی نہیں بلکہ ایک مہمل آفاقیت کے تصور کے خلاف انتباہ ہے[٧]۔

C. B. Macpherson نے عوامی ہجوم کی ناپسندیدہ حکمرانی سے دنیا کے محبوب اور باعزت نظام کے مقام تک جمہوریت کے سفر کو چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

جمہوریت کوئی اچھی اصطلاح نہیں تھی۔ ہر باشعور فرد سمجھتا تھا کہ اپنی اصل روح کے اعتبار سے عوام کی اکثریت کی خواہش کی تابع، عوام کی حکومت، ایک ناپسندیدہ چیز ہوگی، جو فرد کی آزادی اور مہذب طرز حیات کی تمام باوقار خوبیوں کو برباد کر دے گی۔ تاریخ کے ابتدائی دور سے تقریباً سو سال قبل تک تمام ذہین افراد کا یہی مسلک تھا۔ پھر صرف پچاس برس کے عرصے میں جمہوریت ایک اچھی چیز قرار پائی[٨]۔

اگرچہ اب جمہوریت خاص طور پر سوویت یونین کے زوال کے بعد ''ایک اچھی چیز'' قرار پا چکی ہے تاہم دانش مند اور زیرک مبصرین ایسے نظام ہائے حکومت کی بے قاعدگیوں، تضادات اور ناانصافیوں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے جنھیں عام طور پر جمہوریت کا عنوان دیا جاتا ہے۔ یہ عیوب ان مختلف طرز ہائے حکومت میں پائے جاتے ہیں جو عموماً جمہوریت کے عنوان کے تحت آ سکتے ہیں۔ مؤرخ E. H. Carr نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو کچھ پچاس (۱۹۵۰ء) کے عشرے کی ابتداء میں کہا تھا اس کی بازگشت نوے (۱۹۹۰ء) کے عشرے کے وسط میں سنی جاسکتی ہے[۹]۔

Anthony Arblaster اس افسوس ناک نتیجہ تک پہنچا ہے کہ ''تمام دعووں اور بعض حتمی کامیابیوں کے باوجود جمہوریت جدید سیاسیات کے ایجنڈے کی ناتمام کارروائی ہے''[۱۰]۔ مردوں اور عورتوں کو ووٹ کا حق تو مل گیا ہے لیکن ان کی حقیقی اقتدار میں شراکت ممکن نہیں ہوسکی۔ عمومی طور پر ''بورژوا جمہوریت'' کے پس پردہ سرمایہ دار طبقہ ہی معاشرے پر چھایا ہوا ہے اور حکومت کررہا ہے''[۱۱]۔ اور ''۱۹۶۰ء سے آزادی نسواں کی تحریک کا احیاء اس بات کا ثبوت ہے کہ عورتوں کو ووٹ کا حق مل جانے سے مرد و زن کی مساوات کی منزل حاصل نہیں ہوسکی بلکہ عورتوں کے خلاف بعض نہایت واضح امتیازات بھی جوں کے توں موجود ہیں''[۱۲]۔

یہی مصنف اس بات کا بھی شکوہ کرتا ہے کہ ''سیاسی قوت میں مساوی شرکت کا اصول، جس کا مظہر ہر ایک شہری کا ووٹ کا حق ہے، دوسرے ہر پہلو سے سیاسی اختیارات کی تقسیم میں جو واضح امتیازات برتے جاتے ہیں، بالکل متضاد نظر آتا ہے''[۱۳]۔ وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جس پر E. H. Car پہنچا تھا جس کی رائے میں ''ہمیں کم از کم یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ وہ مقاصد جن کے لیے عام آدمی سیاسی جمہوریت کا طلبگار تھا یا کم از کم ووٹ کا حق چاہتا تھا کسی طرح بھی پوری طرح حاصل نہیں ہوسکے''[۱۴]۔ وہ بجا طور پر یہ بھی کہتا ہے کہ ''یہ حماقت ہوگی اگر سمجھا جائے کہ صرف مغربی جمہوریتوں کو جمہوریت سے متعلق تجربات پر اجارہ داری حاصل ہے''[۱۵]۔

میری رائے یہ ہے کہ مغربی لادین جمہوریت کا اپنا مخصوص مزاج ہے اور اس کو جوں کا توں دنیا کے دوسرے خطوں میں برآمد کرنے سے ایک مستحکم اور حقیقی معنوں میں جمہوری اور عادلانہ سیاسی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ دنیا کے مختلف خطوں میں جمہوریت کے جو تجربے کیے گئے ہیں ان سے بہت سے اسباق تو حاصل کیے جاسکتے ہیں لیکن مغربی ممالک کے علاوہ دوسرے ممالک اور بالخصوص مسلم امۃ کو مغربی ممالک کی اندھی نقالی نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے برعکس انہیں اپنی نظریاتی اساس اور تاریخی مآخذوں پر انحصار کر کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اپنی روایات اور اقدار سے ہم آہنگ سیاسی ادارے قائم کرنا چاہییں۔ انسانیت کے تجربات سے کچھ سیکھنے میں کوئی حرج نہیں اور یقیناً موجودہ مغربی دنیا سے بہت کچھ سیکھا بھی جا سکتا ہے لیکن وہی تبدیلیاں ہمارے ممالک کے لیے مفید ہوسکتی ہیں جن کی جڑیں ہماری اپنی تاریخ اور تجربات میں ہوں اور جو ہمارے تہذیبی مزاج اور اقدار کے ڈھانچے کا ایک حصہ تصور ہوں[16]۔

اسلام کا سیاسی نظام

مغرب کے فلسفیانہ اور مذہبی لٹریچر میں مذہب کی اصطلاح جن محدود معنوں میں استعمال ہوتی ہے اسلام ان معنوں میں کوئی مذہب نہیں ہے۔ اسلام کے لفظی معنی پوری طرح سر تسلیم خم کرنے کے ہیں۔ چنانچہ اس کے مطابق انسان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے کلی طور پر اپنا سر جھکا کر اس کی اطاعت قبول کر لیتا ہے اور اس کی ہدایت اور احکامات کی مکمل اطاعت کی پوری پوری ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ مندرجہ بالا توضیح کے مطابق اولاً

(i) اسلام اللہ اور بندوں کے درمیان ایک تعلق کا مظہر ہے اور

(ii) اس بات کا عہد ہے کہ انسان اللہ کی وحی کے ذریعے نازل کردہ ہدایات، جن کا بہترین نمونہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پایا جاتا ہے، کی پوری پوری تابعداری کرے گا، نیز

(iii) اپنے آپ کو امت مسلمہ کا جزو بنانے کی پوری کوشش کرے گا کیونکہ اس امت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اسلام کی ابدی صداقت کی طرف دعوت کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ ایک جامع اور ہمہ گیر طرزِ زندگی ہے۔ ایک دین جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، اخلاقی یا دنیوی، روحانی یا مادی، قانونی یا معاشرتی، معاشی یا تعلیمی، قومی یا بین الاقوامی، غرض یہ کہ زندگی کا کوئی پہلو بھی اس کے دائرے سے خارج نہیں ہے۔ دین مسلمان کی وفاداری کی کسوٹی اور اس کی پہچان ہے اور شریعت وہ مخصوص طریقہ ہے جس کے مطابق عبادت سے لے کر معاشرتی اور معاشی پالیسیوں تک ہر شعبہ کو ڈھالنا لازمی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام کا سیاسی نظام دین کے دیگر پہلوؤں سے مختلف یا آزاد نہیں ہے۔ اسلام میں زندگی کا تصور ایک سالم اکائی ہے۔ جس کا بیج یا نقطۂ آغاز ایمان ہے۔ جو درخت اس بیج سے پھوٹتا ہے وہ انسان کی پوری زندگی کو اپنے سائے میں لے لیتا ہے۔ قرآن اور سنت کی صورت میں اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہدایت ابدی، مکمل اور آفاقی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ ایک ایسا ڈھانچہ مہیا کرتی ہے جس کے اندر رہ کر نہایت متحرک انداز میں زمانے کے تمام ابھرتے ہوئے چیلنجوں کا سامنا کیا جاسکتا ہے۔

یہ ایک طرف تو ایک کائناتی تصور، ایک نظریہ اور مجموعۂ اقدار مہیا کرتا ہے تو دوسری طرف اس میں اس بات کی پوری گنجائش ہے کہ زمان و مکان کے حوالے سے مختلف قسم کی صورت حال کے مطابق تفصیلات مرتب کی جاسکتی ہیں۔ اس کا اصل مدعا و مقصود اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا اور آنے والی ابدی زندگی کے لیے انسان کو تیار کرنا ہے۔ چنانچہ اسلام میں دین اور معاشرہ اور دین اور ریاست اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں، جس طرح دین اور تقویٰ اور دین اور عبادت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ توحید وہ اصل الاصول ہے جس کے مطابق اسلام میں انسانی زندگی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ اس بنیادی اصول کی روشنی میں اسلام کے سیاسی نظام کے کلیدی عناصر یہ ہیں[17]:

(۱) حاکمیت اعلیٰ کا اصل مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی انسان کا خالق، مالک، رب، قانون دینے والا اور ہدایت دینے والا ہے۔ انسان اس کی مخلوق، اس کا بندہ اور اس کا خلیفہ یا نائب ہے۔ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہدایات اور رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پابند ہے۔ نیز اس شریعت کو جو نازل کی گئی ہے نافذ کرنے کا مکلف ہے، تاکہ اسے اطمینان قلب نصیب ہو، دنیا میں امن چین کا دور دورہ ہو اور اسے اپنے خالق و مالک کی رضا حاصل ہو۔ اسی طریقہ کار کی پیروی سے نہ صرف اس دنیا میں امن وسکون، عدل و انصاف، شادمانی و مسرت اور خوشحالی کا دور دورہ ہوگا بلکہ آخرت میں حقیقی نجات حاصل ہو سکے گی۔

(۲) تمام انسان اللہ کے سامنے مساوی حیثیت کے حامل ہیں اور اس کے دیے گئے قوانین کے پابند۔ اسلام کا سیاسی نظام اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ اور شریعت کی بالادستی پر مبنی ہے۔ اس کا جائز قیام اللہ تعالیٰ سے مکمل وفاداری اور نفاذِ شریعت کے عزم اور اس کی مکمل پیروی سے ہی ممکن ہے۔ قرآن پاک اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلسلے میں بالکل واضح ہدایات دیتا ہے:

خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ (الاعراف ۷:۵۴)

فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے۔ (یوسف ۱۲:۴۰)

اے نبیؐ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تا کہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے، اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ (النساء ۴:۱۰۵)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں --- وہی ظالم ہیں --- وہی فاسق ہیں۔ (المائدہ ۵:۴۴-۴۷)

(۳) انسان کی حیثیت اللہ کے نائب اور خلیفہ کی ہے۔ یہ استخلاف ان سب لوگوں کو عطا ہوا ہے جو اللہ کو اپنا رب اور حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیں۔ یہ عمومی خلافت کا اقتدار ہے جس میں تمام مومن شریک ہیں۔ خلافت کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنے معاملات خود چلانے کا محدود اختیار بھی دیا گیا ہے اور یہ اختیار کسی منتخب فرد، خاندان، قبیلے یا گروہ کو نہیں بلکہ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کو تفویض کیا گیا ہے جن کا فرض ہے کہ شوریٰ کے اسلامی اصولوں کے تحت اس حق کا استعمال کریں:

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ (النور ۲۴:۵۵)

ان الوہی ہدایات اور قرآن کے دیگر ارشادات کی روشنی میں ریاست کا جو نظریہ تشکیل پاتا ہے وہ دو بنیادی اصول طے کر دیتا ہے۔ اول اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ اور ثانیاً مسلمانوں کی ''عوامی خلافت''۔ چنانچہ اسلام کا سیاسی نظام صرف اسی صورت میں درست اور جائز قرار پائے گا اگر اس میں اولاً اور لازماً اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ اور اس کے عطا کردہ قوانین یعنی شریعت کی مکمل بالادستی تسلیم کی گئی ہو اور ثانیاً معاشرے پر عوام کی رائے کے مطابق حکومت کی جا رہی ہو۔

اس میں برسر اقتدار لوگوں کے لیے عوام کا اعتماد اور تائید حاصل کرنا لازمی ہے کیونکہ امت مسلمہ ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بحیثیت مجموعی خلافت کے منصب پر فائز کی گئی ہے۔ مندرجہ بالا آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ''استخلاف فی الارض'' کا وعدہ پوری امتِ مسلمہ سے کیا گیا ہے نہ کہ کسی فرد، خاندان، طبقہ یا گروہ سے۔ مومنوں کو عطا کردہ استخلاف ایک عوامی خلافت کی حیثیت رکھتا ہے اور ان میں سے ہر ایک فرد کو یہ حق اور فریضہ بخشا گیا ہے۔

اس بنا پر امت کے فیصلہ کرنے کے طریق کار کو ''شوریٰ'' کا نام دیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے امور باہمی صلاح مشورہ سے سرانجام دیں۔ معاشرے میں ہر فرد کا مقام برابر ہے اور بڑائی اور قیادت کا معیار ان کی قابل بھروسہ وفاداری، اہلیت اور تقویٰ کو ٹھہرایا گیا ہے یعنی یہ کہ اس میں کس حد تک خوفِ خدا، احساسِ فرض اور جواب دہی کا احساس پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک فرماتا ہے:

> اللہ کی نظر میں تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار اور متقی ہے۔

اور اس سلسلے میں حضورؐ کا ارشاد یہ ہے:

> تم میں سے ہر ایک کی حیثیت اپنی رعیت کے لیے نگہبان کی سی ہے اور ہر ایک اپنے اعمال کے سلسلے میں جوابدہ ہے۔

اسلام میں ذات پات، رنگ، نسل، قبیلے اور برتری کے تمام امتیازات کا قلع قمع کر دیا گیا ہے اور بنی نوع انسان میں حقیقی مساوات قائم کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی''۔ قرآن کے مطابق برتری اور بڑائی کا واحد معیار اہلیت اور نیکی کا رویہ ہے جس کے اجزاء علم، جسمانی اہلیت اور تقویٰ ہیں۔

۴۔ اسلام کے نظام سیاست میں اطاعت کا اصول حقوق و فرائض کے خطوط کی تشریح کرتا ہے۔ یہ دو امتیازی پہلوؤں کا حامل ہے۔ اول اللہ اور اس کے رسولؐ سے وفاداری اور دوسرا عوام کی آزادیٔ تقریر، بحث و تمحیص، اختلاف رائے اور معاشرت کے تمام امور میں شرکت کا حق ہے۔ اس میں حکمرانوں سے اختلاف کرنے اور ان پر تنقید کرنے کا حق بھی شامل ہے۔ قرآن کا حکم اس سلسلے میں یہ ہے:

> اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو
اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔
(النساء۴:۵۹)

حکمرانوں کے سامنے حق بات کہنے کی اہمیت حضورؐ کے اس ارشاد سے واضح ہوتی ہے:

جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے۔

پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

تم میں سے کوئی اگر کسی برائی کو دیکھے تو ہاتھ سے اس کو روک دے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے اس کو روکے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو (کم از کم) اسے دل میں بُرا جانے اور یہ ایمان کی کمزور ترین حالت ہے۔

ان رہنما اصولوں کی روشنی میں اسلامی سیاسی نظام کی واضح تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اسلام کے معاشرے کی بنیاد ایمان پر ہے۔ اس کا اصل اصول اللہ اور اس کے پیغمبرؐ سے وفاداری ہے اور فیصلے اللہ کی رہنمائی یعنی شریعت میں دیے گئے اصولوں، اقدار اور ہدایات کے مطابق کرنا ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اسلام میں کسی مراعات یافتہ اور مقدس طبقے کا کوئی وجود نہیں۔ دنیوی معاملات میں تمام اختیارات میں معاشرے کا ہر فرد شریک ہے اور قانون کے سامنے مساوی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کے حقوق اور فرائض برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق تمام ذاتی، شہری، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔

حکمرانوں کو کسی قسم کی من مانی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ وہ بھی ملک کے قوانین کے سامنے برابر کے جواب دہ ہیں بلکہ ان پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے حقوق بالخصوص معاشرے کے کمزور طبقوں کے حقوق کی ادائیگی یقینی بنائیں۔ انسانی حقوق شریعت میں طے کر دیے گئے ہیں اور کسی کو ان میں کمی بیشی کرنے یا ان سے روگردانی کرنے کا اختیار نہیں۔ حریت اور مساوات اس معاشرے کی روح ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کا مقصد وجود۔ شوریٰ یعنی باہمی مشورے اور فیصلوں میں شرکت اس کا طریقِ کار ہے۔ اس کے تمام معاشرتی، معاشی، سیاسی اور دیگر معاملات میں ہر سطح پر فیصلوں کا یہی راستہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ حکمرانوں کے لیے لازمی ہے کہ انہیں عوام کا اعتماد حاصل ہو اور وہ ان کے سامنے جواب دہ ہوں۔ چنانچہ سیاسی اختیارات اور قوت کو، شریعت کی بالادستی اور عوام کے اعتماد پر استوار کرنا لازمی ہے۔ حکمران نہ صرف اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں بلکہ قانون اور عوام کے سامنے بھی ذمہ دار ہیں۔ اگر ان اصولوں اور اقدار کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے تو پھر کسی بھی قسم کا سیاسی ڈھانچہ قابل قبول ہے۔

چونکہ اسلام کی ہدایات اور رہنمائی حتمی، آفاقی اور دائمی ہے، اس لیے امت مسلمہ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ مختلف معاشرتی اور تاریخی حالات کے پس منظر میں نظامِ حکومت چلانے کے لیے مناسب طریق کار، ادارے اور انتظامی ڈھانچے وضع کر سکے۔ اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے مختلف انداز کے حکومتی ڈھانچے اور شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ ماضی میں اس سلسلے میں کئی تجربات کیے جا چکے ہیں اور حال اور مستقبل میں نئے تجربات کی پوری گنجائش ہے۔ یہی اسلامی اصولِ سیاست کا حسن اور صلاحیت اور پچھلے چودہ سو برس میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا ممتاز پہلو ہے۔

مسلم سیاسی نظام کی تاریخ

پیغمبر اسلامؐ نے نہ صرف ذاتی زندگی اور بندے اور خدا کے درمیان روحانی تعلق کے سلسلے میں ایک نمونہ پیش کیا بلکہ ایک ایسا معاشرہ اور ریاست بھی قائم کی جو بعد میں مسلمانوں کے سیاسی اور تاریخی تجربات کے لیے ایک ماڈل ثابت ہوا۔ 'بیعت عقبہ ثانی' اور 'میثاقِ مدینہ' نے وہ اساس مہیا کی جس پر مدینہ کی ریاست اور معاشرہ کی تعمیر ہوئی۔ امت کی نظر میں حضور اکرمؐ اور خلفاء راشدین کا دور اسلامی سیاسی نظام کے لیے ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نمونہ کی چند نمایاں صفات یہ ہیں:

۱۔ جیسا کہ پہلے تفصیلی بیان ہو چکا ہے پہلا اصول قانون کی حکمرانی اور قانون کے سامنے سب کی مساوی حیثیت ہے۔

۲۔ دوسرا اہم اصول قرآن و سنت کی بالادستی ہے البتہ جن معاملات میں قرآن و سنت میں رہنمائی موجود نہ ہو ان میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ اجتہاد کا مطلب قانون کے نئے جنم لینے والے مسائل کا شریعت کے عمومی اصولوں کی روشنی میں عالمانہ اور منظم حل تلاش کرنا ہے جو عقلِ سلیم بھی تسلیم کرتی ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلم قوانین کا پورا ڈھانچہ، جو تہذیب انسانی کے لیے مسلمانوں کا سب سے بڑا تحفہ ہے، ایک منطقی، جمہوری اور مقبولِ عام طریق کار کے ذریعے تشکیل پاتا ہے اور اس کی تشکیل میں گہری دلچسپی لینے والے صاحبِ علم افراد نے باہمی تبادلہ خیالات، مکالمے اور بحث و تمحیص کے ذریعے حصہ لیا ہے۔ ان قوانین کی رضا کارانہ قبولیت اور ان کی اطاعت سے ان تمام مکتبہ ہائے فکر کے جواز کو بھی تسلیم کر لیا گیا جو قوانین کی اس تشکیل کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔

یہ تاریخ کے حیرت انگیز حقائق میں سے ہے کہ مسلمانوں میں قوانین کبھی بھی حکمرانوں کی رضا اور پسند پر منحصر نہیں رہے جبکہ اُس دور میں تقریباً تمام معاشروں اور تہذیبوں میں قوانین برسر اقتدار لوگوں کے چشم و ابرو کی منظوری سے تشکیل پاتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کا قانونی ڈھانچہ تمام تر ایوان ہائے اقتدار سے باہر معرض وجود میں آیا اور یہ قوانین حکمرانوں پر اسی طرح نافذ العمل ہیں جس طرح عوام پر۔ اس طریق کار نے مطلق العنان طاقت کا راستہ روک دیا اور مسلمان معاشرہ میں ایسی جمہوریت کی اصل ساکھ کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا جس میں عوام پوری طرح شریک تھے۔ John L. Esposito اور John O. Voll اپنی تصنیف ''اسلام اور جمہوریت'' میں لکھتے ہیں:

> مشرقی استبداد کی طویل تاریخ میں اختیارات کی تقسیم یا حکمرانوں کی قوت کو محدود کرنے کا کوئی تصور نہیں۔ لیکن کلاسیکی مسلم معاشروں میں حکمرانوں کو کبھی ایسے غیر محدود اختیارات حاصل نہیں رہے اور یہ صورتِ حال سیاسی نظام کے اسلامی قوانین اور تاریخی تجربہ میں نمایاں نظر آتی ہے۔--- مسلمانوں میں منضبط اسلامی قوانین کی بنیاد خلفاء کی ہدایات اور احکامات پر نہیں بلکہ مسلم فقہا کے اتفاقِ رائے پر رکھی گئی ہے۔ کسی حکمران کو بھی قانون پر فوقیت حاصل نہ تھی بلکہ ان کے کردار اور طرزِ عمل کو اسی قانون کی کسوٹی پر پرکھا جاتا تھا[۱۸]۔

۳۔ اجتماعی فیصلوں میں ہر سطح پر سیاسی قیادت کے انتخابات میں شوریٰ کا اصول نافذ العمل تھا۔ پہلے چاروں خلفاء کا انتخاب قوم نے کیا، اگرچہ ان کے انتخاب کے طریق کار اور عوام سے منظوری لینے کے طریقے مختلف تھے۔ لیکن عوام کی رضامندی اور اعتماد اور ان کے سامنے جواب دہی کا اصول سب میں مشترک رہا۔ جب عوام کے ذریعے انتخاب کا اصول ترک کر کے موروثی اقتدار کا سلسلہ چل نکلا تب بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیعت کی ظاہری شکل قائم رکھی گئی۔ اس دور میں بھی نصیحت، شوریٰ، اختلاف، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور احتساب کے ادارے مختلف انداز میں نہایت اہم کردار ادا کرتے رہے۔

۴۔ انسانی حقوق کا احترام، عوام، اقلیتوں اور معاہد ریاستوں اور اقوام کے بارے میں معاہدوں کی ذمہ داریوں کا احترام مسلمانوں کے سیاسی نظام کا سدابہار پہلو رہا ہے۔

۵۔ عدلیہ کی انتظامیہ سے مکمل علیحدگی اور ہر سطح پر آزادی مسلم سیاسی نظام کا ایک اور لازمی اور اہم جزو رہا ہے۔ اسی بنا پر قانون کی عمل داری اور ہر فرد کو انصاف کی فراہمی کا اصول مسلم معاشرے کے جزو لاینفک کے طور پر نمایاں رہا اور اسی وجہ سے مسلمان ممالک عمومی طور پر استبدادی حکمرانوں کے جبر سے بچے رہے۔ تقسیم اختیارات کا یہ اصول جو خلفاء راشدین کے عہد میں پروان چڑھا اسلامی نظام میں بعض پہلوؤں سے انحطاط آجانے کے باوجود بعد کے دور میں بھی زندہ رہا۔ مسلمانوں کے سیاسی نظام میں دستور یعنی اسلام کی بالادستی ایک لازمی حصہ رہی۔ Esposito اور Voll سلطنت عثمانیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے ایک پہلو کی نشان دہی کرتے ہیں:

> شاہی دور کے علماء کا یہ حق مسلمہ تھا کہ وہ سلطان کی طرف سے جاری کردہ کسی قاعدے یا قانون کو اس بنا پر غیر مؤثر قرار دے دیں کہ وہ اسلام کے قوانین سے متصادم ہے۔ اگرچہ سیاسی وجوہات کی بنا پر عملاً اس حق کا استعمال بہت کم کیا گیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ علماء کے سلسلہ کا سربراہ یعنی شیخ الاسلام، اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کی بنیاد پر سلطان کی تنزلی کا حکم جاری کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس اختیار کا استعمال بھی کم ہوا لیکن سلطان ابراہیم (۱۶۴۸ء)، محمود چہارم (۱۶۸۷ء)، احمد ثالث (۱۷۳۰ء) اور سلیم ثالث (۱۸۰۷ء) کے معاملے میں ہم اسے بروئے کار آتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ ان رسمی کارروائیوں میں حکمرانوں کے اختیار پر یہ قدغن کہ علماء دستور یعنی قانونِ اسلام کے نمائندہ ہیں پوری طرح جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اسلامی ورثے میں تقسیم اختیارات کی صلاحیت کا آئینہ دار ہے[۱۹]۔

۶۔ مسلمانوں کے سیاسی نظام کا ایک اور اہم پہلو سوشل سیکورٹی کا وہ نظام ہے جس کی بنیاد زکوٰۃ (جو امراء سے غرباء کے لیے لازمی ادائیگی کا سلسلہ ہے)، صدقات (جو رضاکارانہ عطیات کا نام ہے)،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقف (جو ٹرسٹ کی صورت میں ہوتا ہے)، انفاق (جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا نام ہے)، وصیت، ورثہ (جس کی بنیاد پر متروکہ مال اور جائیداد ورثاء میں بٹ جاتی ہے اور خیر (یعنی بخش دینے) پر رکھی گئی ہے۔ ان تمام عناصر اور اجزاء پر عمل کر کے مساوات پر مبنی معاشی اور معاشرتی نظام تشکیل پایا جس میں ہر فرد باعزت زندگی گزار سکتا تھا۔ معاشرہ کی معاشی تنظیم اس طرح کی گئی تھی کہ معاشرہ کے پس ماندہ افراد بھی اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر سیاسی اور معاشی سرگرمیوں میں پوری طرح شریک ہو سکیں۔

۷۔ مسلمانوں کے سیاسی نظام کا ایک اہم پہلو اختلافِ رائے کے حق کو تسلیم کرنا ہے جو انفرادی اور اجتماعی دونوں معاملات میں دیا گیا ہے۔ یہ حق متند ہے جسے کسی خارجی عمل کی حیثیت سے نہیں بلکہ روایت کے ایک لازمی جزو کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اختلاف اور فتنہ یعنی بغاوت میں امتیاز کیا گیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ بعض مسلم فقہا کے نزدیک مخصوص حالات میں اور طے شدہ شرائط کے مطابق خروج یعنی مسلح بغاوت بھی درست قرار پاتی ہے۔ Esposito اور Voll تسلیم کرتے ہیں کہ

> قرآن اور سنت کا حتمی معیار قرار پانا تاریخ اسلامی میں اصولِ تنقید کی بنیاد کے طور پر ہمیشہ مانا گیا ہے۔ اس بالادست معیار کی بنا پر اختلاف، اصلاح اور نشاۃ ثانیہ کی اسلامی تحریکیں ہمیشہ جائز قرار پائی ہیں۔ دورِ جدید میں یہ اصول اسلامی دستور کے نفاذ کی بنیاد بن سکتا ہے اور اس سے ریاست کی حدود متعین کرنے اور اختلاف رائے کو قانونی حیثیت دینے میں مدد مل سکتی ہے[۲۰]۔

یہ سات اصول مسلمانوں کی حکمرانی کے طریقوں کی وضاحت کرتے ہیں اور ممتاز خصوصیات کی حامل ایک ماڈل اسلامی جمہوری حکومت کے قیام کی نشان دہی کرتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں اسلامی جمہوریت کے ماڈل کے قیام کے لیے یہ محرک اور رہنما ثابت ہو سکتے ہیں۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی شورائی نظام ـــــ ایک تقابلی جائزہ

اب تک کی گفتگو کی روشنی میں دونوں نظاموں میں اختلاف اور عدم مطابقت کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح بعض باہمی دلچسپی کے امور اور مسائل بھی سامنے لائے جا سکتے ہیں اور اس طرح ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے کے تجربے سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اسلام کا طریق کار منفرد ہے۔ اسلام انسانوں کی شخصیت اور روح دونوں کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ ہر انسان، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کے اندر کی روحانی بالیدگی اور نشوونما ہے، جو اسلامی نظام کو حقیقی قوت عطا کرتی ہے۔ اسلام میں تبدیلی کی ابتدا فرد کے اندر سے ہوتی ہے۔ اس کا آغاز ''ایک اخلاقی فرد'' کے وجود کی تخلیق سے ہوتا ہے، جو ایک اخلاقی اور عادلانہ معاشرے کے قیام میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ امت ایک عالمگیر برادری ہے۔

امت مسلمہ کے طول وعرض میں مختلف گروہ، وحدتیں، بلکہ ریاستیں بھی ہوسکتی ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی وہ ایک کلی نقش کے مختلف اجزاء ہوں گے۔ اسلام ایک ایسا مہذب معاشرہ تشکیل دیتا ہے جو گوناں گوں اداروں کا ایک مجموعہ ہے۔ ریاست ان میں سے ایک ادارہ ہے جو اگرچہ بہت اہم اور اعلیٰ ہے لیکن اس کے باوجود وہ پوری برادری اور اس مہذب معاشرے کا محض ایک عضو یا جزو ہے۔

اسلام میں معاشرتی، سیاسی اور معاشی اصولوں میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ سب مل کر ایک ایسا نظریاتی معاشرہ بناتے ہیں جو معیاری اصولوں پر استوار ہوتا ہے اور جس میں سے خدا خوفی، عدل اور احسان جھلکتے نظر آتے ہیں۔

معاشرے کی بنیاد مساوات، اخوت، باہمی تعاون، معاشرتی ذمہ داری، عدل اور سب سے مساوی سلوک پر رکھی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہوتا ہے جس میں قانون کی پاسداری کی جاتی ہے اور جس میں اقلیتوں سمیت تمام افراد کے حقوق و فرائض پوری طرح محفوظ ہوتے ہیں۔ ریاست کا مقصدِ وجود عوام کی خدمت اور عدل و انصاف کا قیام ہوتا ہے۔ اس میں مطلق العنانی، جبر اور حکمرانوں کی خود آرائی پر مبنی حکومت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

اسلامی ریاست مغربی جمہوریت کے براہِ راست مقابل اس لیے بھی ہے کہ یہ عوام کی حاکمیت اعلیٰ کی مخالف ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ ہی قادرِ مطلق ہے اور شریعت ملکی قانون ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ابھرنے والے مسائل کا حل شریعت کی روشنی میں تلاش کر کے حالات کا سامنا کیا جاتا ہے۔ یہی پہلو دونوں نظاموں میں بنیادی فرق کی نشان دہی کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں تک قانون کی بالادستی، بنیادی حقوق کے تحفظ، عدلیہ کی آزادی، اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری اور حکمرانوں کے انتخاب اور پالیسیوں کو عوام کی رضا کے مطابق تشکیل دینے کا تعلق ہے، اسلام اپنی متعین حدود کے اندر ان کو یقینی بناتا ہے۔ ان امور کی حد تک مغربی جمہوریت اور اسلام میں بہت کچھ مشترک ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں مسلمان مغرب سے اور مغرب مسلمانوں کے تجربات سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ اس کے باوجود قانون کی نوعیت اور مآخذ مختلف ہونے کی وجہ سے دونوں نظام واضح طور پر جداگانہ حیثیت کے حامل اور اپنی جگہ منفرد ہیں۔

اگرچہ اسلامی ریاست کی پہچان شریعت کی بالادستی ہے لیکن یہ بہرحال اس مذہبی حکومت (theocracy) سے قطعاً مختلف ہے جس کی مثالیں تاریخ میں فراعنہ کے دور، بابل کے عہد، یہودیوں، عیسائیوں، ہندوؤں اور بدھوں کے ہاں ملتی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان بھی بہت بنیادی نوعیت کے امتیازات پائے جاتے ہیں۔

تھیوکریسی میں مذہبی طبقے کے ذریعے خدائی حکومت کا تصور تھا، جس کا کہا قانون کی حیثیت رکھتا تھا، جس سے اختلاف کی گنجائش قطعاً نہ تھی۔ اسلام میں کسی خصوصی مراعات یافتہ مذہبی طبقے کا الگ وجود ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ حاکم اعلیٰ ہے۔ اس کی ہدایات قرآن وسنت میں واضح طور پر موجود ہیں۔ شریعت ایک معروف اور معین چیز ہے جو ہر فرد کی پہنچ میں ہے۔ یہ کوئی خدائی راز نہیں جس کے صرف مذہبی رہنما امانت دار ہوں۔ اسلام میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ چند لوگ عوام پر اپنی مرضی مسلط کر دیں یا ان کو خدا اور مذہب کے نام پر دوسروں کے مقابلے میں ترجیحی مقام دے دیا جائے۔ قانون کی نشوونما اور نفاذ، کھلے عام مباحثے اور تبادلہ خیال سے ہوتا ہے اور اس میں ہر فرد شریک ہوتا ہے۔ مختصراً ان دونوں نظاموں میں واضح فرق درج ذیل ہیں۔

(۱) شریعت جو منشاء خداوندی کا لب لباب ہے، مکمل غیر متغیر اور غیر متبدل صورت میں موجود ہے جس پر کوئی تبدیلی یا مداخلت اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

(۲) اسلام میں کسی ایسے طبقے کا وجود نہیں جو مذہبی معاملات میں خدا کے ترجمان یا رابطہ کا ذریعہ بن سکے۔ پیغمبری کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور اللہ کی طرف سے ہدایت کی تکمیل ہو چکی۔ اب یہ امت کا کام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ وہ انسانیت کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت میں ادراک پیدا کرے اور اس کو زیرِ عمل لائے۔

(۴) فرد معاشرے کا بنیادی پتھر ہے اور معاشرہ اس کی آزادی، قانون کی بالادستی، اختلافِ رائے اور اپوزیشن کا احترام یقینی بناتا ہے۔ عوام اور پریس کھلے بندوں مختلف مسائل پر بحث و تمحیص کرنے اور شورائی نظام کے تحت انہیں حل کرنے میں آزاد ہیں۔ اسلامی فقہ کا سارا سلسلہ ایک ایسے انداز میں مرتب ہوا ہے جس میں عوام اور ان کے نمائندوں نے بغیر کسی قدغن کے سرعام شرکت کی۔ اسلامی ریاست اور معاشرے کا فرض ہے کہ انسانوں کے تمام مادی اور دنیوی مسائل کو عدل و انصاف اور معاشرے کی خوشحالی کے اصولوں کے تحت حل کریں۔

لادین ریاست جن امور سے تعلق رکھتی ہے اسلام اور مسلمان بھی ان سب سے متعلق رہتے ہیں۔ لیکن اسلامی ریاست کی ان مسائل تک رسائی لادینی ریاست سے بالکل مختلف انداز میں ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ پورا کرہ ارض میرے لیے مسجد کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے دائرہ کار میں دنیا کے ہر حصے کے بارے میں فکرمندی پائی جاتی ہے۔ یہ کسی طور سے بھی نہ شرقی ہے نہ غربی بلکہ صحیح معنوں میں آفاقی ہے۔ اس طرح یہ انسانی زندگی کے ہر پہلو، خواہ وہ روحانی ہو یا دنیوی، پر حاوی ہے۔

اس حد تک اسلام کا لادینیت (secularism) سے کوئی تنازعہ نہیں کیونکہ یہ لادینیت اس مذہبی جمود کے ردعمل میں وجود میں آئی جس نے دنیوی معاملات سے پوری طرح صرفِ نظر کرکے اپنے آپ کو صرف روحانی دنیا تک محدود کر لیا تھا۔ اسلام رواداری کا پوری طرح قائل ہے، جیسا کہ قرآن میں صاف کہا گیا ہے کہ ''دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں''۔ اسلام کثرتیت کا قائل ہے اور انسانوں کو عقیدے اور پیشے کے بارے میں آزادی دیتا ہے۔ اسلام ثقافتوں کی بوقلمونی اور مختلف انداز زندگی کو تسلیم کرتا ہے۔ اسلام کی حدود کے اندر مختلف نوع کے طرز بود و باش جنم لے سکتے ہیں۔ اسلام کا تنازعہ سیکولرزم سے یہ ہے کہ اس میں دین، خدائی رہنمائی اور مستقل اخلاقی اقدار سے بے نیاز ہو کر انسانی مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ اسلام کے تصورِ حیات کی عین ضد ہے اور اس نقطہ نظر سے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اگرچہ کمیونزم اور فاشزم کا دور بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے لیکن اب بھی بعض لوگ ان نظریات کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مختلف صورتوں کے پیروکار ہیں۔ یہ دونوں نظریہ ہائے حیات مغربی تہذیب کے پس منظر میں کچھ مخصوص تاریخی، سیاسی اور معاشرتی حالات کی پیداوار ہیں۔ ان دونوں میں ریاست کا ہمہ گیر اور مطلق العنان ہونا مشترک ہے۔ یہ دونوں مختلف قسموں کی آمریت اور استبدادی طرزِ حکومت کے مظہر ہیں، اگرچہ دکھاوے کے لیے الیکشن اور پارلیمنٹ کا ڈھونگ بھی رچایا جاتا رہا ہے۔

اسلام میں یک طرفہ حکمرانی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام میں ریاست، مہذب معاشرے کا ایک حصہ ہے جس میں فرد اور اس کے حقوق نیز سیاسی معاملات میں فیصلہ کرنے کے اختیارات کو مرکزی مقام دیا جاتا ہے۔ اسلامی ریاست کی بنیاد قانون کی حکمرانی پر ہے اور وہ اسی سے تشکیل پاتی ہے۔ اس میں حکام بھی ہر شہری کی طرح قانون کے سامنے اپنے اعمال کے لیے برابر کے جواب دہ اور ذمہ دار ہیں۔

بلکہ اسلامی ریاست میں برسرِ اقتدار لوگوں کو وہ تحفظات اور مراعات بھی حاصل نہیں جو بہت سے مغربی جمہوری ممالک میں انہیں حاصل ہیں۔ اسلام میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی ممکن ہی نہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ایک مقدس امانت سمجھا جاتا ہے۔ فرد ہی کو معاشرے کی بنیادی اکائی سمجھا جاتا ہے، وہ ایک اخلاقی وجود ہے جس کی آخری جواب دہی بالآخر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے۔

ہر فرد ایک مقدس وحدت ہے اور اپنے اختیار کردہ اعمال اور طرزِ عمل کے لیے اس دنیا میں اور آخرت میں جواب دہ ہے۔ فرد پر لازم ہے کہ وہ معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے ذمہ دارانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کرے لیکن وہ ریاست کی مشین میں بے جان پرزے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اسلام کے سیاسی نظام اور مطلق العنان اور استبدادی نظریات میں بعد المشرقین ہے۔

اس تجزیاتی تقابل کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام کا سیاسی نظام دیگر سیاسی نظریات سے بعض مماثلتوں کے باوجود ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام خلقی طور پر ایک مکمل وحدت ہے اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں لانا چاہتا ہے جس میں اخلاقیات کے پابند فرد کے لیے وہ مشکلات جنم نہ لیں جن سے اسے ایک غیر اخلاقی معاشرے میں سابقہ پڑتا ہے، اور نہ انسان جانوروں کے ایک ریوڑ کی طرح ایک باڑے میں مقید کر دیے جائیں۔

اسلام اس بات کو یقینی بنانا چاہتا ہے کہ انسان کو جتنی مادی اور روحانی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیک وقت پروان چڑھیں اور پھلیں پھولیں اور وہ ایک عادلانہ ماحول میں پرامن زندگی گزار سکے جس کا مقصد و مدعا بالآخر اللہ کی رضا کے حصول اور ابدی سکون سے ہمکنار ہونا ہو۔ اسلامی ریاست ایک ایسی نظریاتی ریاست ہے جو فرد کی تعلیم و تربیت کرتی ہے اور باہمی مشاورت سے ایسا سیاسی اور سماجی ماحول پیدا کر دیتی ہے جس میں صحیح جمہوریت نشو و نما پاسکتی ہے۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور جمہوریت ـــــ عصر حاضر کا چیلنج

عصر حاضر میں مسلم دنیا کو ایک انوکھا چیلنج درپیش ہے۔ اس دور میں تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کی اقتدار پر گرفت ختم ہو گئی اور تقریباً تمام مسلم ممالک نوآبادیاتی نظام کے شکنجے میں جکڑے گئے۔ نوآبادیاتی غلامی کی طویل رات میں، جو تقریباً دو صدیوں پر محیط ہو گئی، معاشرہ ذہنی، اخلاقی، معاشی اور ثقافتی انحطاط کا شکار ہو گیا۔ اس مصیبت کا بدترین پہلو یہ تھا کہ وہ ادارے جو تقریباً بارہ سو برس تک مسلم امہ کے اندرونی استحکام کا باعث بنتے رہے اور جن کی مدد سے اس نے اندرونی اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کیا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔

نوآبادیاتی دور میں مغربی دنیا نے محکوم اقوام کو تہذیب سکھانے کے خود ساختہ مشن کے تحت مغربی اداروں کو مسلم ممالک میں پروان چڑھانا شروع کیا اور یہ استعماریت کی بدترین شکل تھی۔ قانون، عدلیہ، معیشت، تعلیم، حکمرانی کا ڈھانچہ، زبانیں، ادب، فنون، طرزِ تعمیر مختصر یہ کہ معاشرے اور ثقافت کے ہر جزو کو زبردستی مغربی رنگ میں ڈھالنے کا کام شروع کیا گیا۔

نوآبادیاتی نظام نے مسلمان ممالک میں ایک نئی قسم کی قیادت کو بھی جنم دیا جو اگرچہ خود ان میں سے تھی لیکن ان سے مختلف تھی۔ اسے بابو کلاس کا نام دیا جا سکتا ہے۔ آرنلڈ ٹائن بی نے ان کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ یہ طبقہ وہ تھا جس کی اپنے عقائد، ثقافت اور تاریخ میں کوئی جڑیں نہ تھیں اور جنہوں نے نوآبادیاتی حکمرانوں کے سائے تلے اپنی ایک نئی شناخت وضع کرنے کی کوشش کی۔ اس طبقہ کی زندگیوں میں نہ صرف بالادست قوتوں کی اقدار اور تصورِ حیات کی عکاسی ہوتی تھی بلکہ یہ ان کے مفادات کا محافظ بھی تھا۔ یہ طبقہ مقامی اور بیرونی عناصر کے خود غرضانہ مفادات کے لیے ان سے مکمل تعاون کی راہ پر سرگرم عمل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہتا تھا۔

مسلمان ممالک میں آزادی کی تحریکوں کا سرچشمہ جذبہ حریت اور جذبہ ایمانی سے پھوٹا اور مسلمان ممالک میں مسلم قومیت کی تحریک نے بھی ایک اسلامی شناخت حاصل کر لی لیکن یہ لوگ مغربی اقدار کی پیروی میں مگن رہے اور دانستہ یا نادانستہ طور پر استعماری قوتوں کے ایجنٹ بنے رہے[۲۱]۔ سوئے اتفاق کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اکثر مسلم ممالک میں سیاسی قیادت اسی مغرب زدہ طبقہ کو ملی جس کی تربیت و پرداخت نوآبادیاتی دور میں ہوئی تھی اور جو مغرب کے ساتھ اس کی ثقافت اور سیاسی منصوبہ بندیوں کے حوالے سے، مسلسل رابطہ میں تھا۔ افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ مسلم دنیا میں نہ صرف سیاسی سرحدوں کا تعین غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھوں ہوا بلکہ نئی قیادت اور ادارے بھی ان ہی کے ذریعے پروان چڑھے۔ مسلم دنیا میں موجودہ بحرانی کیفیت اور عدم اطمینان کی تہ میں یہی شتر گربگی کارفرما ہے۔

اسلامی احیاء کی تحریک اور اقتدار میں عوام کی شرکت ایک ہی صورت حال کے دو پہلو ہیں۔ اقتدار میں عوام کی مؤثر شرکت اور اسلامی تصورات کے مطابق معاشرے اور سیاسی ڈھانچے کی تشکیل اس سلسلے کے لازمی اجزاء ہیں۔ ان مقاصد کا حصول اسی صورت میں ممکن ہے کہ عوام اور حکمرانوں میں مکمل اعتماد باہمی ہم آہنگی اور تعاون کا جذبہ پایا جاتا ہو۔

بدقسمتی سے جس قیادت نے نوآبادیاتی حکمرانوں سے اقتدار ورثہ میں پایا ہے ان میں اور عوام میں نظریاتی، اخلاقی اور سیاسی مطابقت کا نام ونشان بھی موجود نہیں۔ حکمران چاہتے ہیں کہ وہ معاشرے اور اس کے اداروں کو مغربی تصورات اور تماثیل کے مطابق تشکیل دیں، جس کے اجزاء لادینیت، قومیت، سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت وغیرہ ہیں۔ وہ ان قوانین، اداروں اور پالیسیوں کا نفاذ چاہتے ہیں جو مغرب سے اخذ کیے گئے ہیں۔ عوام ان کوششوں کو اپنے عقائد، اقدار اور امنگوں اور آرزوؤں کے برعکس سمجھتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ آزادی کے باوجود مسلم ممالک میں حکومتوں کا نظام بالارادہ اور بلا ارادہ مستبد اور مطلق العنان رہا ہے۔ اگرچہ بعض ممالک اس سے مستثنیٰ کہے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں تاریخ کا سبق بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ مسلم معاشروں کو مغربی رنگ میں رنگنا اور لادینیت کی راہ پر ڈالنا جبر واستبداد کے بغیر ناممکن ہے۔ اسلام اور اس کی سچی جمہوریت میں، جس میں عوام پوری طرح شریک ہوں، کوئی عدم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطابقت نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عوام کی آزادی، بنیادی حقوق، اقتدار میں عوام کی شرکت اور معاشرے کو اسلامی رنگ میں ڈھالنا اس کا لازمی نتیجہ ہیں۔

البتہ عوام کی اسلامی امنگوں اور حکمران طبقوں کی مغرب زدہ اور سیکولر پالیسیوں میں کشمکش اور تصادم پایا جاتا ہے کیونکہ مسلمان عوام پر غیر اسلامی قوانین اور نظریات بہ جبر ہی ٹھونسے جاتے ہیں۔ ان ہی دو مخالف تصورات میں ہر طرح کی عدم مطابقت پائی جاتی ہے اور اس کشمکش میں مغربیت کا بلڈوزر سب سے پہلے جمہوریت کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ امریکہ کے ماہر عمرانیات Filmer S.C. Northrop نے انسانی معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے اصل مسئلہ کی نشان دہی کر دی ہے۔ وہ کہتا ہے:

> میری رائے میں یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے (سیکولر) قوانین پہلے پہل کسی آمر کو ہی نافذ کرنا پڑتے ہیں۔ یہ کسی عوامی تحریک کے نتیجے میں برپا نہیں ہو سکتے کیونکہ عوام قدیم روایات کے پکے پیرو ہیں[۲۲]۔

Wilfred Smith نے اسی تناظر میں بات کرتے ہوئے پاکستانی صورت حال کے بارے میں ایک دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ''کوئی مشرقی قوم جس حد تک جمہوریت کو اپناتی ہے (یعنی جس سے اس کی اپنی فطرت کا اظہار ہوتا ہے) اس حد تک وہ مغربیت سے دور ہو جاتی ہے---جس حد تک پاکستان، مصنوعی نہیں بلکہ حقیقی، جمہوریت اپنائے گا اتنا ہی وہ مغربی نہیں بلکہ اسلامی ہوتا چلا جائے گا[۲۳]۔ وہ بلا کم و کاست اعتراف کرتا ہے کہ ''اسلام کے بغیر جمہوریت محض لفاظی ہے اور جو کسی تتبع یا رشک کے قابل نہیں''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم ممالک میں ''جمہوریت کا نفاذ ایک پہلو سے اسلام کا نفاذ بن جاتا ہے جو ان کے نزدیک ان کی پسندیدہ اسلامی ریاست کی تعریف کا حصہ ہے''[۲۴]۔

Esposito اور Voll بھی اسلامی دنیا کی موجودہ صورت حال کی صحیح تفہیم کے بہت قریب ہیں۔ وہ اسے ''اسلام کے احیاء اور جمہوریت کے فروغ کے دو یکساں رجحانات کی حامل'' قرار دیتے ہیں۔ وہ آج کے مسلمان ذہن کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> بہت سے مسلمان اسلامی جمہوریت کا صحیح مفہوم متعین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دینی احیاء کا عالمی سلسلہ اور جمہوریت کا فروغ نہ صرف ایک دوسرے کی تکمیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر سکتے ہیں بلکہ مسلم دنیا میں فی الواقعی کر رہے ہیں ۲۵۔

مسلمانوں کی سیاسیات کے ایک حالیہ مطالعہ میں Dale Eickelman اور James Piscatori نے بھی موجودہ دور میں مسلمانوں کی جمہوریت کے لیے لگن کی طرف ایک نیا اندازِ فکر اختیار کرنے کی اہمیت اجاگر کی ہے، جس میں مسلمانوں کی اپنی اقدار اور نظریات سے وابستگی اور مغرب سے درآمدہ تصورات سے بیزاری کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

> مسلم سیاسیات کے مخصوص تناظر میں [پہلے سے موجود] مثالوں پر کم زور دیتے ہوئے اور آئندہ سالوں میں پالیسی سازوں کو درپیش چیلنجوں کا دوبارہ جائزہ لینے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ صرف مغرب زدہ اشرافیہ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں میں سے اٹھنے والی دیگر بہت سی صداؤں پر بھی کان دھرنا لازمی ہوگا۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اُن کی ثقافت کے مقبول تصورات کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ ان کے ہاں اقتدار کے جواز اور عدل سے کیا مراد ہے۔ نیز یہ مان لیا جائے کہ عادلانہ نظام کے بارے میں مذہبی اور غیر مذہبی نظریات حتمی حیثیت نہیں رکھتے --- بالآخر اس افہام وتفہیم کے نتیجے میں مسلمانوں کے بارے میں ان بے سوچے سمجھے قیاسات کی حقیقت کھل جائے گی کہ مسلمانوں کا تعلق دوسری اقوام سے زیادہ تر معاندانہ ہوتا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کا اندازِ حکومت بلا استثناء جابرانہ اور مستبد ہوتا ہے ۲۶۔

اسلام اور مسلم امہ کے اذہان وقلوب میں، من مانی کرنے والی اور جابرانہ حکومتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں بھی استبدادی حکومتیں قائم ہیں وہ مسلمانوں کے تصورات ونظریات، ان کی تاریخ یا معاصرانہ امنگوں اور آرزوؤں کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ انہوں نے نوآبادیاتی نظام اور مغربیت سے جنم لیا ہے۔ مسلمان جمہوریت کے مغربی نظریہ کو اپنے اصولوں، اقدار اور روایات کے منافی سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس ان کے جمہوریت اور حکومت میں عوام کی شرکت کے بارے میں اپنے تصورات اور روایات ہیں جس کے نتیجہ میں ہر سطح پر عادلانہ اور شورائی نظام، حقوق کا احترام، اختلاف کا حق، عدلیہ کی آزادی اور سیاست اور ثقافت میں گوناگوں سلسلوں کا وجود یقینی ہو جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام اور جمہوریت کی اس روح میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ عالم اسلام میں جہاں جہاں جابرانہ اور آمرانہ حکومتیں قائم ہیں وہ غیر اسلامی اور جبراً نافذ کی گئیں روایات کے نتیجے میں قائم ہوئی ہیں اور احیاء اسلام کی تمام تحریکیں ان کے خلاف جدوجہد کر رہی ہیں۔ اسلام اور حقیقی جمہوریت ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ چنانچہ اسلام اور جمہوری انداز حکومت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

جابرانہ حکومتوں کا قیام خواہ وہ سول ہوں یا ملٹری، منتخب ہوں یا موروثی، جو جمہوریت کی نفی اور بنیادی آزادیوں کے استحصال کی ذمہ دار ہیں، اسلام کی نہیں بلکہ مغربیت اور لادینیت کی بنا پر وجود میں آئی ہیں۔ عوامی جمہوریت کو کچلنا اور اس سے انکار کرنا لادینیت اور مغربیت کا ایجنڈا ہے اسلام کا نہیں۔ اسلام کے لازمی تقاضے اور عوام کی آرزوئیں، امنگیں اور خواہشات تو ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ عالم اسلام میں جمہوریت کی ترویج لازماً اسلام کے نفاذ کی طرف پیش قدمی ہوگی۔ اسلامی تصورات اور نظریات کا عملی صورت میں سامنے آنا صرف جمہوری راستے سے ہی ممکن ہوگا۔

نو آبادیاتی دور کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کی حالیہ تاریخ میں استبداد، سیکولرزم اور سوشلزم ساتھ ساتھ رہے ہیں جبکہ اسلام کی احیاء کی تحریکیں، عوام کی حریت اور عوام کی اقتدار میں شرکت کی جدوجہد، کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے ہیں۔ اگرچہ امت مسلمہ نے براہ راست نو آبادیاتی جبر سے نجات حاصل کر لی ہے لیکن اپنے نظریات، اقدار اور روایات کے مطابق اپنی سیاست، معیشت اور معاشرے کو ڈھالنے کے لیے آزادانہ اختیار، جو اس کا جمہوری حق ہے، اس کے حصول کی جدوجہد جاری ہے۔

مسلم امہ ان تصورات اور مثالوں کے تحت زندگی گزارنے سے منکر ہے جو اس کی اقدار کے خلاف، اس کی تاریخ کے لیے ناگوار اور اس کی روایات کے نزدیک قابلِ اعتراض ہیں۔ اگر جمہوریت سے مراد عوام کو خود اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا حق اور اپنی اجتماعی تکمیل کی آزادی ہو تو یہی وہ چیز ہے جس کے لیے مسلمان عوام اور اسلام جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ان کی مساعی اس [مقصد] سے نہ ذرہ برابر کم ہیں اور نہ ذرہ برابر زیادہ۔

[Khurshid Ahmed, "Islam and Democracy: Some Conceptual and Contemporary Dimensions", *The Muslim World,* Volume 90, No. 1 & 2, Spring 2000, pp. 1-21]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حواشی

1-Francis Fukuyama, *The End of History and the Last Man* (New York: The Free Press, 1993).

2- Samuel P. Huntington, "The Clash of Civilizations"?, *Foreign Affairs*, Vol. 72, No. 3, Summer 1993, pp. 22-49.

اس نظریے پر بحث کے لیے دیکھیے: *Foreign Affairs*, Vol. 72, No. 4, pp. 2-26, No. 5, pp. 186-194. ہنٹنگٹن نے اپنے نظریے کو اپنی بعد میں آنے والی کتاب میں مزید تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں اٹھنے والے سوالوں کے جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے:

The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order, (New York: Simon and Shuster, 1996).

3. W. B. Gallie, *Philosphy and the Historical Understanding* (London: Chatto+Windus, 1964), p.158.

4. *Encyclopaedia of Islam*

5. Richard Jay, "Democracy", in Robert Eclesholl, et. al., *Political Ideologies: An Introduction*, second edition (London: Routledge, 1994), p.129).

6. *International Encyclopaedia of Social Sciences*, The Macmillan Co.,Vol. 3, pp. 113-118.

7. Thomas Carothers, "*Democracy without Illusions*", *Foreign Affairs*, Jan/ Feb, 1997, pp. 90.

8. C.B. Macpherson, *The Real World of Democracy* (Oxford: Clarendon Press, 1966), p.1.

9. E.H. Car, *The New Society* (London: Macmillan, 1951), p. 76.

''آج جمہوریت کے دفاع میں ایک ایسی چیز کے طور پر بات کرنا، جسے ہم جانتے ہیں اور جس پر کئی عشروں یا کئی صدیوں سے عمل پیرا ہیں، خود فریبی اور شرم کا باعث ہے--- ایک معیار کی تلاش ضروری ہے جو روایتی اداروں کی بقا میں نہیں بلکہ اس سوال میں پنہاں ہے کہ [اصل] طاقت کس کے پاس ہے اور اسے کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جمہوریت [درحقیقت] تدریج کا معاملہ ہے۔ آج [دنیاں میں] کئی ممالک دوسروں سے زیادہ جمہوری ہیں، لیکن اگر جمہوریت کا کوئی بلند معیار اپنایا جائے تو شائد کوئی [ملک] بھی بہت زیادہ جمہوری نہیں ہے''۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

10. Anthony Arblaster, *Democracy* (Open University, 1994) p. 96.

۱۱- ایضاً،ص۹۶

۱۲- ایضاً،ص۹۷

۱۳- ایضاً،ص۹۸

۱۴- ایضاً،ص۹۸

۱۵- ایضاً،ص۱۰۰

۱۶- جمہوریت کے موضوع پر بے شمار لٹریچر دستیاب ہے۔ چند اہم مصنفین جن سے استفادہ کیا گیا، درج ذیل ہیں:

David Helf, *Models of Democracy* (U. K 1987); John Keans, *Democracy and Civil Society* (London, 1998); Robert A. Dahl, *Democracy and its Critics* (New Haven, C. T. 1989); David Held, "Democracy: The Native State and the Global System", in David Held (ed) *Political Theory Today* (Cambridge U. K. 1991); Robret A. Dahl, *A Preface to Democratic Theory* (Chicago, 1963); Giovanni Sartori, *The Theory of Democracy Revisited*, (Chattam, N. J, 1987); J. Lively, *Democracy* (Oxford: Blackwell, 1979); A. Arblaster, *Democracy* (Buckingham, 1994; C. B Macpherson, *The Real World of Democracy* (Oxford 1966); M. J. Crozier, S.P. Huntington and J. Watenula, *The Crisis of Democracy* (New York University Press, 1975).

۱۷- عصر حاضر میں لکھے جانے والے اسلامی لٹریچر میں بھی ''اسلام اور جمہوریت'' کے موضوع پر خاطر خواہ مواد موجود ہے۔ چند اہم مطالعات درج ذیل ہیں:

Sayyed Abul A'la Mawdudi, *Islamic Law and Constitution*, ed. Khurshid Ahmad (Lahore: Islamic Publications, 7th edition 1980); *Islam, Democracy; The State and the West,* A Round Table Discussion with Dr. Hasan Turabi (Tampa, Fla., 1993); Fatima Mernissi, *Islam and Democracy: Fear from the Modren World*, tr, Mary Jo Lakaland (Readings: M A 1992); John L Esposito and John O. Voll, *Islam and Democracy* (New York: Oxford University Press, 1996); *Islamic Resurgence: Challanges, Directions and Future Prespectives,* A Round Table Discussion with Khurshid Ahmed, ed. Ibrahim Abu-Rabi (Tampa. Fla., 1995); Dale F. Eickelman and James Piscatori, *Muslim Politics*

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(Princeton University, 1996).

توفیق الشوی،فقہ الشوریٰ (قاہرہ:۱۹۹۳ء)،شوریٰ فی الاسلام،۳ جلدیں،البیت فاؤنڈیشن،اومان،
(اردن،۱۹۹۰ء)

18. John L Esposito and John O. Voll, *Islam and Democracy* (New York: Oxford University Press, 1996), p. 41.

۱۹-ایضاً،ص ۴۸-۴۹

۲۰-ایضاً،ص ۴۱

۲۱-H. A. R. Gibb اپنی کتاب *Modern Trends in Islam* میں لکھتے ہیں:
''قوم پرستی اپنی مغربی توضیح کے مطابق صرف ان [مسلم] دانشوروں تک محدود ہے جو مغربی افکار سے بالواسطہ یا بلا واسطہ واقفیت رکھتے ہیں [متاثر ہیں]۔قوم پرستی کے تصور نے جب عوام کے ذہن میں جگہ بنائی تو وہ مسلم عوام کی صدیوں کی [ذہنی] جبلت [تربیت] اور رجحانات کے تحت تبدیل ہوگیا اور اس تبدیلی سے بچا بھی نہیں جاسکتا تھا''۔
(*Modern Trends in Islam*, Chicago: Chicago University Press, 1947, p. 119).

Wilfred C. Smith اپنی کتاب *Islam in Modern History* میں رقم طراز ہے:
''کسی مسلم قوم میں قومیت کے ایسے جذبات [کبھی] پروان نہیں چڑھے جن کا مطلب اسلام کی حدود سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کسی قوم یا فرقے سے وفاداری ہو، یا محض قوم کو [اسلام پر کسی بھی پہلو سے] فوقیت دینا ہی کیوں نہ ہو --- ماضی میں صرف اسلام نے ہی ان لوگوں کو اس طرح کا نظم و ضبط [ڈسپلن]، امنگ اور وجدان (inspiration) اور توانائی فراہم کی ہے''۔(Princeton, N. J. 1957،ص ۷۷)

22. Filmer S. C. Northop, *Colloquium on Islamic Culture* (Princeton University Press, 1953), p. 109.

23. Wilfred C. Smith, *Pakistan and Islamic State* (Lahore: Ashraf, 1954), p. 50.

۲۴-ایضاً،ص ۴۵

25. Esposito and Voll, Op. Cit. 21.

26. Dale F. Eickelman and James Piscatori, *Muslims Politics* (Princeton University Press, 1996), p. 164.

© rasailojaraid.com